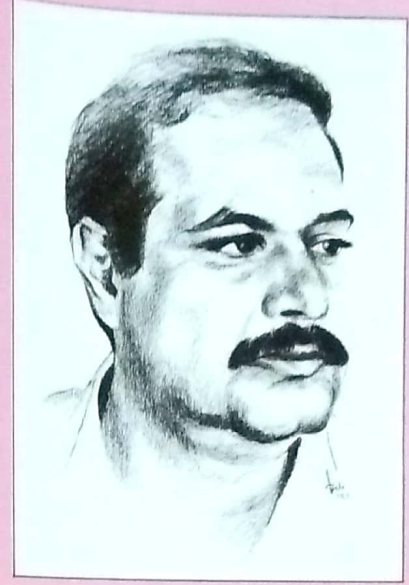


بارش کی ساتویں شام

امجد بہزاد

بارش کی ساتویں شام

امجد بہزاد



--- امجد بہزاد سرکوں کو باراد کہتا ہے۔۔۔ اور شہر کو بے امان مانتا ہے۔ راستوں کو
کہکشاں اور شہر کو قاتل گردانتا ہے۔۔۔ بادباں کھلے رکھتا ہے۔ کہ منتشر لوگوں میں رہنا
نہیں چاہتا۔ جتنی جنگھاتی سرکوں پر تادیر گھومتا چاہتا ہے اور جنگلوں کی طرف ہجرت کا
تمنا ہی ہے۔ مگر۔۔۔ وہ چاہتا کہیں بھی نہیں کہ نامعلوم رویہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا
ہے۔
امجد کی شاعری میں اسے رویے کا اظہار اور ہر کلمہ کی سطح پر نئی دنیا کی نشاندہی ہوتی ہے۔
نامعلوم بھی نہیں ہے۔ یہ رویہ ایسے اشعار میں سراٹھا کر دیکھتا ہوا آپ کو مل سکتا ہے۔
اور اسی سے امجد کا لہجہ منفرد ہو جاتا ہے۔

زمین زادوں سے امجد کٹ کے بیٹا غیر ممکن ہے
سندر سے جزیروں کو ہا ہوتے نہیں دیکھا

ناصر علی سید

Ketabton.com

خدا۔ کاسر عبد ستر
انسان قلوب سے محبت سائل
اعظم

۔۔۔ حالت اپنے دور میں گردن ڈوٹی رہا۔۔۔ رائد اور
میراگی اپنے دور میں۔

آج بھی بعض شراہ اپنی تجرباتی شاعری اور
فشا کے لئے مفاہیم کے باعث قدماء کی نظر میں
تاشول ہیں۔ لیکن نیامیں پر دور کا پرول دست ہوتا
ہے۔ وہ فنی لب و لہجے اور دانش کی نئی راہیں تلاش
ہے۔

امجد ہر کوئے دور کی نئی سوچ کے متروک اظہار کا شاعر
ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "پادش کی ساتوں شام"
تھے پادشوں نئی فشا اور پادش کے تازہ تر موتی
قطروں کی مالا ہے۔ اپنی نئی جگہ دمک نئی تازگی
کا پیام ہے۔ ایسی کتاب کہ نئے دور کے شعر پسند
حضرات کو غالب، اقبال، فیض، ندیم اور فراز کے
ساتھ ملا کر پڑھنے سے شاعری کا ارتقاء اور بدلتے لب
و لہجے کا مرقع حاصل ہوگا۔

پروفیسر طاہر غزنوی

۔۔۔ امجد کی شاعری میں کسار کی برف پوٹی پوٹی
سے سرمئی پانی کی سرگوشی سنی جاسکتی ہے۔
پس آپ کنگشاں زہر پا ہونے کے منظر ناپیدہ
دیکھیں گے اور وہ بھی ایسی ایسام کی فشا میں جو
لحم و لوراک سے مضرب ہے۔

پروفیسر غلام محمد قاسم

۔۔۔ امجد خراب خانوں میں اپنی دیانت کے ستر
پر نکلا ہوا انوجوان شاعر ہے۔ خراب خانوں کے منظر
بھی طرح طرح کے اسرار اور مہرے رہتے ہیں۔ سو وہ
سحر زدہ ہے انتظار ہے کہ مسودہ امجد کو اس سفر میں
منظروں کے لمس کی سرخوشی نصیب آجائے۔

سجاد ہار

PDF by Tahir Abid Taair

--- اہد کے کلام میں جو اور بھینٹنی ہے۔ وہ اس کی اپنی راہی شخصیت کی عطا ہے۔۔۔ اشد میں ایسی کیفیت ہے۔ جس میں آج تک کوئی نام نہ دے سکا۔ اس کے لیے میں موسیقی کے سارے سر گونج رہیں ہیں۔ "بارش کی ساتویں شام" کی دھنک آسان ادب پر متنوع رنگوں کا ساتھ طوع و جبری ہے۔ دیکھنا ہے کہ اپنی ہی سروں میں گم، اپنے الفاظ کے تال پر رقص کتال چارے ادب شاعر اس کا سواکت کس طرح کرتے ہیں؟

اجہد بہراؤ کی شاعری میں دھنک کے سارے رنگ
وجود ہیں مگر ان رنگوں کو پینٹ کرتے ہوئے اجد
جس نے انداز اور نئے لیے کولہا بنایا ہے۔ اس نے اجد
کی شاعری کو ایک خوبگوار حیرت سے بھنا کر رکھا ہے۔
اس کے لیے کی انفرادیت میں جہنیت کا کوئی
احساس نہیں ملتا بلکہ ہر جتنے والا تہ تجربات اور نئے
آہنگ کو اپنی ہی بات سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ اجد
کی غزل اور نظم دونوں میں "قلبی واردات" ایسی
پوری شدت کیساتھ موجود ہے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس
واردات کو اس نے روایت کیساتھ ساتھ جدت
کا پیریں بھی دیا ہے اور یہی خصوصیت اسے بسیر
میں نمایاں کرتی ہے۔

یوسف عزیز آمد

بارش کی ساتویں شام

امجد بہزاد

Printed by: Peshawar Process, Peshawar City.
Ph. (P.P): 250662-212743

جملہ حقوق بحق ”فریدہ نور“ محفوظ

انتساب

یقیناً خدا نے سب سے پہلے دوستی کا رشتہ تخلیق کیا ہوگا

شعیب الدین اور فردوس خان

کے نام

نام کتاب : بارش کی ساتویں شام
مصنف : امجد بہزاد
تاریخ اشاعت : اکتوبر ۱۹۹۷ء
سرورق : جہانزیب ملک
کمپوزر : ادریس شاہ کمپوزنگ سنٹر قصہ خوانی پشاور
اہتمام : سردار نعیم

رابطہ

انجمن بہزاد عابد سٹریٹ گل بہار
کالونی نمبر ۱۰ پشاور شہر

۱۰۱	ماہ تمام چکا
۱۰۳	وہ بھی خیال و خواب
۱۰۵	خداؤں کی حفاظت
۱۰۷	دیکھ تجھے ہوگا
۱۰۸	رات مجھے رستے میں
۱۱۰	کسی کو دیکھ کر
۱۱۲	کسی جہاں میں
۱۱۳	گلاں کیسے کروں
۱۱۴	سارا شہر ہی
۱۱۶	کھڑا ہوں کب سے
۱۱۷	دو شعر
۱۱۸	وہ شام
۱۱۹	سب سزاؤں کی
۱۲۱	یہ دیکھی دیکھی سے
۱۲۳	شیشہ دل
۱۲۴	آخری حیرت باقی ہے
۱۲۵	ہزار لوگوں میں
۱۲۷	دو شعر
۱۲۸	یہ کیا کہ صبح شام
۱۳۰	آواز
۱۳۲	موسم کڑا تھا
۱۳۳	شب سیاہ میں
۱۳۴	کون سنا کہ کے عتاب
۱۳۵	خواب میں کسی ہوئی نظم
۱۳۷	شہر کے سب باسیوں کا
۱۳۸	یہ کیا کہ لطف شام
۱۳۹	کوشش کی بات کی
۱۴۰	حسرت

۱۱	اپنی آنکھیں اپنے خواب
۱۷	خدا سے
۱۸	میں اور وہ
۱۹	نگار حسن کو بے آئندہ
۲۱	رات کا تناسل ہے
۲۳	تیری مرضی جو تو چاہے
۲۴	خائبہ
۲۵	اک جہاں منظر کا
۲۶	یہ میں نے تم سے
۲۸	اک مستقل نباہ
۳۰	وہ اگلے موڑ پہ
۳۱	کس قدر ادا کی ہے
۳۳	بدل جانے کا دیکھ
۳۴	آخری خواب
۳۷	یہ واقعہ آج کا نہیں
۳۸	دور تک تناسل کو
۴۰	نیل نلک کو
۴۲	یہ جو تیری آنکھوں
۴۳	ایک شعر
۴۴	جبر
۴۵	ندی کنار میں اور تو
۴۶	ہر منظر اک نوحہ
۴۸	اک دشت بے کنار
۵۰	سارے ہر تناسل کے
۵۲	پسپانی
۵۳	شام غم یہ تو بتا
۵۴	دور شہر سے جنگل میں
۵۵	بارش کی ساتویں شام
۵۶	اے تناسل تیرا کوئی ہمارا نہیں
۵۷	صبح کا منہ سوج
۵۸	کٹر کو ایمان کر سکتا ہوں میں
۶۱	ہوا یہ کیا کہ فقر انا
۶۲	زندگی
۶۳	اے کاش کہ کوئی
۶۵	ڈیپرشن
۶۶	پروین شاکر
۶۷	آب زر کی بے کرانی
۶۹	کیا شب تھی
۷۰	جادو سا کوئی جاگا
۷۲	پاکستان
۷۳	شرے توقیر میں
۷۶	مہم خواب
۷۷	محمودی
۷۸	شہر کے اور کچھ نہ کیا
۷۹	میں تم سے دور
۸۱	تیز ہوا تھی
۸۳	غنی خان
۸۵	اعتراف
۸۶	ایک منظر
۸۷	منی کا آدمی
۸۹	میں ہوں جاؤں
۹۰	یہ چپ ہے کیسی
۹۱	نقش ہونا
۹۳	فارغ بچاری
۹۵	خود سے اب
۹۶	یہ چپ کی ممد
۹۷	تناسل میں بھی
۹۹	ابر بہار شام
۱۰۰	قطعہ

اپنی آنکھیں اپنے خواب

رئیں فروغ کا ایک شعر ہے

آنکھیں جو بے حال ہوئی ہیں دیکھ لیا تھا خواب پرایا
اس حوالے سے جب ہم اردو شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شعراء کی
اکثریت پرانے خواب دیکھنے پر مامور ہے۔ جب سے خوابوں کا قحط پڑا ہے مستعار خوابوں کے ہجوم
نے شاعری کی پوری فضا کو گرد کے منظر نامے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کمرے میں بہت کم شاعر
ایسے ملیں گے جنہیں اپنے خوابوں کا اجالا راستہ دکھاتا ہے انہی کم شاعروں میں امجد بنزاد کا نام
شامل کیا جاسکتا ہے ہمارے اس نوجوان شاعر کی آنکھیں اس لئے بے حال نہیں ہوئیں کہ یہ
اپنے خواب دیکھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں اور پھر تعبیر کی خواہش اس خواب گول ماحول کو
مزید پر اسرار اور طلسماتی بنا دیتی ہے

جادو سا کوئی جاگا بادل کے برسنے پر
اک منظر نو چکا موسم کے بدلنے پر

نقڑی آواز کوئی بن گئی زنجیر پا
دشت کے تنہا سفر میں ہم کو رکنا پڑ گیا

خاک جاں میں بھی تو اک حیرت کدہ آباد ہے
کیوں یہ میری چشم ویراں دیکھتی ہے دور دور

شاعری میں اپنی بات کہنے کے مضمرات بتاتے ہوئے رئیس فروغ نے کہا تھا

جس دن سے اپنی بات رکھی شاعری کے بچ
میں کٹ کے رہ گیا شعراء کرام سے

لیکن انفرادیت کی راہ پر چلنے والے اس آگ میں بے خطر کو پڑتے ہیں۔ رئیس امرود
کے الفاظ میں

یا رب غم عشق کیا بلا ہے
ہر شخص کا تجربہ جدا ہے

لہذا جو شاعری انفرادی تجربہ بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتی وہ کلیشے سے آگے نہیں
بڑھتی اور امجد ہنزاد کو زندگی اور شاعری دونوں میں روایتی رستوں پر چلنا ناپسند ہے
امجد ہنزاد کے کلام پر نظر ڈالنے سے پہلا تاثر یہی ابھرتا ہے کہ یہ نوجوان انتہائی صداقت
سے اپنا لہجہ دریافت کرنے کے کرب ناک عمل میں مبتلا ہے۔ اس کی شاعری میں کسار کی برف
پوش چوٹی سے سرمئی بادل کی سرگوشیاں سنی جا سکتی ہیں۔ یہاں آپ کلمکشاں کو زیر پا ہونے کے
منظر نا دیدہ دیکھیں گے اور وہ بھی ایک ایسی اہم کام کی فضا میں جو فہم و ادراک سے معتبر ہے۔
امجد ہنزاد کا شمار ان شعراء میں کیا جا سکتا ہے جو نظم و غزل پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ اس
کی شاعری میں جہاں عناصر کا ذکر ہوا ہے وہ مقامات اس کی مجموعی شاعرانہ فضا میں بہت بلندی پر
واقع ہیں۔

کیا شب تھی کہ مئے تھے اطراف کناروں کے
اور قافلے ٹھہرے تھے دریا میں ستاروں کے

دکھ تجھے ہو مگر شر کو جل جانا ہے
تیرے شاعر نے بہت دور نکل جانا ہے

پھول خوبانیوں کے جھومتے ہیں
کر رہی ہیں ہوائیں بوس و کنار
اور میں اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں

ہر موسم کا اپنا اپنا مول ہوا کرتا ہے
سرا کی برقی ہوا میں آؤ منائیں سوگ

میں وہ ہوں

جو سمندر کی تہوں میں
نیل گوں چپ چاپ پانی میں
کسی من موہنی سی جل پری سے گفتگو میں محو رہتا تھا

چند اچھی نظمیں یا غزلیں تخلیق کرنا اتنا مشکل کام نہیں جتنا کہ شاعری کے لئے نیا زمین
نیا آسمان پیدا کرنا ہے۔ امجد ہنزاد نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کا اپنا تجربہ اور اس تجربے کا اظہار
ہے۔ شاعری کے نگار خانے میں اس نے اپنے دکھ سکھ حوط کر کے بھجائیں ہیں۔

ہر چند تیرا قرب مری دسترس میں تھا
میں نے ترے وجود کو آدھا نہیں کیا

نکس پانی میں جو دیکھا تو بہت رنج ہوا
یہ کھلا آج کہ دریا کی روانی کیا ہے

امجد ہنزاد نے حکیمانہ خواب دیکھنے کی قبل از وقت خواہش سے دامن بچا کر اپنے فن کی
بلاغت برقرار رکھی ہے اس کا ہر خواب اس کی چھوٹی موٹی آرزوؤں کی شکست و ریخت کا بیانیہ

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاع ہنر کو میں

غالب

ہے۔ یہاں آپ کو ایسے بچے کی سسکیاں سنائی دیں گی جو جلیتِ جنس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا
کھلونا خود توڑ دیتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ امجد بھڑاد نے کہیں کہیں قوانین کی حد تک آزادی برقی
ہے ورنہ فکر رواں کے بتے دھارے میں وہ مروجہ سانچوں سے مکمل بغاوت کا اظہار بھی کر سکتا
تھا۔

کفر کو ایمان کر سکتا ہوں میں
جنگ کا اعلان کر سکتا ہوں میں
اور اب یوں ہے کسی لمحے میں بھی
شر کو ویران کر سکتا ہوں میں

کہتے ہیں سوال کبھی غلط نہیں ہوتا اس کا جواب نامعلوم یا غلط ہو سکتا ہے۔ امجد بھڑاد کی
شاعری اپنے عہد سے کچھ سوال کرتی ہے۔
شب سیاہ میں یہ روشنی سی کیسی ہے

سوچتا ہے اک فریادی
کون ہمارا حاکم ہے

یہ ہوا ہے کیا کہ تھے نہیں تری انگلیاری کا سلسلہ
لمحہ وصل کا کیا ربط ہے سرشاری سے ہوا
بجر کا کرب ہے کیا یہ آنکھ کا پانی کیا ہے ہوا
آئے امجد بھڑاد کے کلام میں ان سوالوں کے جواب تلاش کریں

پروفیسر غلام محمد قاصر

خدا سے

میں نے تجھ کو سوچا نہیں ہے دیکھا ہے

میں نے تجھ کو کھیلے دیکھا باغوں میں بچوں کے ساتھ
میں نے تجھ کو ہنستے دیکھا سرخ ریلے ہونٹوں میں
میں نے تجھ کو روتے دیکھا مظلوموں کی آنکھوں میں
میں نے تجھ کو قبر میں دیکھا آندھی اور طوفانوں میں
میں نے تجھ کو بے خود دیکھا شام ڈھلے پیانوں میں
میں نے تجھ کو سوچتے دیکھا پھیلے ہوئے صحراؤں میں
میں نے تجھ کو سوتے دیکھا ہرے بنوں کے سایوں میں
میں نے تجھ کو گاتے دیکھا بارش اور ہواؤں میں
میں نے تجھ کو رقصاں دیکھا معشوقوں کی بانہوں میں

میں نے تجھ کو سوچا نہیں ہے دیکھا ہے



نگارِ حسن کو بے آئینہ ہوتے نہیں دیکھا
تو کیا تم نے بھی کوئی سانحہ ہوتے نہیں دیکھا

مگر کل شام یہ منظر مری آنکھوں میں کھلنا تھا
پرندوں کو درختوں سے خفا ہوتے نہیں دیکھا

رعایا نے بھی بینائی کسی جنگل میں دفنا دی
کہ شاہوں نے کسی کا بھی بُرا ہوتے نہیں دیکھا

میں اور وہ

میں یہ کہتا ہوں سفر آسان ہونا چاہیے
وہ یہ کہتا ہے نہیں ہلکان ہونا چاہیے

میں یہ کہتا ہوں نموشی عشق کی معراج ہے
وہ یہ کہتا ہے نہیں اعلان ہونا چاہیے

میں یہ کہتا ہوں بڑے بے کیف ہیں لیل و نهار
وہ یہ کہتا ہے کوئی ارمان ہونا چاہیے

میں یہ کہتا ہوں "خدا" کا عکس ہے میرا وجود
وہ یہ کہتا ہے نیا امکان ہونا چاہیے

میں یہ کہتا ہوں مٹھلے مجھ پر جمالِ کائنات
وہ یہ کہتا ہے نہیں حیران ہونا چاہیے

میں یہ کہتا ہوں خن کچھ بھی نہیں جُڑ دردِ سر
وہ یہ کہتا ہے نہیں دیوان ہونا چاہیے



رات کا تنہا سفر ہے، روشنی ہے دور دور
ایک بابِ غم کھلا ہے اور خوشی ہے دور دور

میں کھلے میدان میں ہوں منتظر بے سائبان!
وہ گھنے جنگل میں مجھ کو ڈھونڈتی ہے دور دور

شر کے دیوار و در پر خوف کی اک بیل ہے
وہ محبت کی کہانی لکھ رہی ہے دور دور

باروں نے بھی تیرے وصل کی جھوٹی تسلی دی
کسی موسم کو میں نے بے ریا ہوتے نہیں دیکھا

چلو ہم ہی تمہیں یہ منظرِ نادر دکھلا دیں
کہ تم نے ککشاں کو زیرِ پا ہوتے نہیں دیکھا

زمیں زادوں سے امجد کٹ کے جینا غیر ممکن ہے
سمندر سے جزیروں کو رہا ہوتے نہیں دیکھا

.....

تیری مرضی جو تو چاہے

اے ری دنیا!

تیری مرضی جو تو چاہے

میرا کیا ہے تیرے جیسا ہو جاؤں گا

جو تو کہے گی وہی کروں گا

کوئی کویتا نہیں لکھوں گا

تیری لے میں کھو جاؤں گا

تیری لے وہ لے ہے کہ جس میں

ایسی چیختی راگنیاں ہیں

جن کو سن کر پنکھ پکھیراڑاڑ جائیں

بادل جنگل اور سمندر

چپ ہو جائیں روٹھتے جائیں

اپنے مدھر گیتوں کی تانیں توڑتے جائیں

اے ری دنیا تیری مرضی جو تو چاہے

شدتیں ہیں ماند لیکن دورِ دل جو تھا سو ہے
غیر موسم میں بھی کوئل گونجتی ہے دور دور

خاکِ جاں میں بھی تو اک حیرت کدہ آباد ہے
کیوں یہ میری چشمِ ویراں دیکھتی ہے دور دور

یہ فباہِ کارواں ہے یا سرائے غم کی سمت
اک ہوائے تیز ہے جو چل رہی ہے دور دور

منتشر لوگوں میں امجدِ تاجکے ہو صبح و شام!
ایک آوازِ درا میں نے سنی ہے دور دور



اک جمالِ منتظر کا مان رکھنا پڑ گیا
تیز بارش میں ہمیں گھر سے نکلنا پڑ گیا

نقڑی آواز کوئی بن گئی زنجیرِ پا
دشت کے تنہا سفر میں ہم کو رکنا پڑ گیا

بے ستارہ رات پر اس نے کیا افسوس کیا
تیرگیِ شب میں مہجنگو کو چمکنا پڑ گیا

اس کا کنا ہے محبت راز رکھنی چاہیے
کتنی مشکل میں ہمارا شعر کنا پڑ گیا

بد دعا یہ رات کی ہے یا تلون ہے مرا
صبح کے آغاز کا انجام کرنا پڑ گیا

شائبہ

وہ جو برہنہ پریت پر دو پیڑ کھڑے ہیں

اک دوجے سے کچھ دُوری پر

جیسے کہ میں ہوں

جیسے کہ تو ہے

وہ بھی ہیں کچھ دُورے دُورے سے

ہم بھی ہیں کچھ سسے سسے

شام سے کی دُکھی ہوا میں

دونوں ملنا چاہتے ہیں پر مل نہیں سکتے

کسی نے مجھ کو صدا تو دی تھی
میں اپنی ضد میں ٹرکا نہیں تھا

وہی تھا عہد زوال میرا
جب آئینہ آئینہ نہیں تھا

نہیں ہے یوں بھی کہ موت آئی
بس اتنا ہے میں جیا نہیں تھا



یہ میں نے تم سے کہا نہیں تھا
کہ میرے گھر میں دیا نہیں تھا

چار جانب تھا ہو کا عالم
مری زمیں پر خدا نہیں تھا

ہوا میں سیٹی سے بچ رہی تھی
کوئی کسی کا رہا نہیں تھا

تہائیوں نے ہم کو خود آرا سا کر دیا
زخمِ ہنر کی دل نے نمائش ہی کی نہیں

ہم طول دے تو سکتے تھے شبِ ہائے وصل کو
اُس چشمِ سرگیں نے گزارش ہی کی نہیں

آخر سخنوروں کو بھی چُپ سا دھنا پڑی
تو نے کسی سخن کی ستائش ہی کی نہیں



اک مستقل نباہ کی خواہش ہی کی نہیں
ہم نے ترے خلاف یہ سازش ہی کی نہیں

کرنا تھا جس کے بحر میں ہم نے کسی کو یاد
سرمہ کے بادلوں نے وہ بارش ہی کی نہیں

بے عشق روز و شب کا ہمیں بھی ہے دکھ مگر
حسنِ بتاں نے دل میں رہائش ہی کی نہیں



کس قدر اُداسی ہے
بات گو ذرا سی ہے

یہ زمین صدیوں سے
کس کے خوں کی پیاسی ہے

بامراد سڑکوں پر
کیسی بد حواسی ہے

خواہشوں کے جنگل میں
سرپھری ہوا سی ہے



وہ اگلے موڑ پہ میرے لئے رکا ہو گا
کسی سے کیا کہ وہ خود سے بھی ڈر گیا ہو گا

خوشا وہ لمحہ کہ جب اس کے ہونٹ چومے تھے
اور اب یہ سوچتا ہوں کیا وہ سوچتا ہو گا

وہ میرے جسم کے اُسرار لے کے بچھڑا تھا
اکیلی راتوں کو وہ کیسے کاٹتا ہو گا

یہ مدّھ بھی ہے کہ وہ میرا شریکِ کرب رہا
میں جاگتا ہوں تو وہ کیسے سُہکا ہو گا

یہ شر گنگ سہی میرے حق میں اے امجد
وہ ایک شخص مگر مجھ سے بولتا ہو گا

.....

بدل جانے کا دکھ

مجھے کیا جانتے ہو تم

مجھے پہچانتے ہو تم۔۔۔

میں وہ ہوں۔۔۔ جو سمندر کی تہوں میں۔۔۔ نیلگوں چپ چاپ پانی میں

کسی من موہنی سی جل پری سے گفتگو میں محو رہتا تھا

میں وہ ہوں۔۔۔ جو درختوں کے خنک سایوں میں سو کر

جاگتا رہتا تھا ان گزرے زمانوں میں

میں وہ ہوں۔۔۔ جو نگارِ شہر کی ہر جاں ستاں مصروفیت سے

امن کی خاطر

ہمیشہ لڑتا رہتا تھا

ریلے گیت لکھتا تھا

میں وہ ہوں۔۔۔ جو سسکتی شام کو

اک ہمسکراتی شام کرنے میں

شرابی دوستوں کو ڈھونڈ کر ہنگامہ کرتا تھا

مجھے کیا جانتے ہو تم۔۔۔

مجھے پہچانتے ہو تم۔۔۔

چاندنی کی ہجرت پر

رات بے نوا سی ہے

کون مجھ کو پہچانے

کس سے روشناسی ہے

خامشی کے صحرا میں

نفر کی ندا سی ہے

معتبر گھرانوں کا

عشق بھی سیاسی ہے

راز یہ کھلے امجد

تو ولی کہ عاصی ہے

—

کہ سبزپتوں پہ ساری خوشیوں کو نقش کر دیں
 اب اس سے پہلے کہ موت آئے
 خموش سرما کی بارشوں میں
 ایلی سرکوں کو اپنے قدموں کی چاپ دے دیں
 کہ بعد اپنے کے خبر ہے خموش سرما کی بارشوں میں
 کسی کا سایہ دکھائی دے گا؟
 کسی کی آہٹ سنائی دے گی؟
 اب اس سے پہلے کہ موت آئے
 بیاضِ شب میں وہ خواب لکھ دیں
 کہ دیدہ و دل کے واسطے جو
 گلاب بھی ہیں عذاب بھی ہیں
 یہ خواب، جب ہم نہیں رہیں گے
 کسی کی آنکھوں ستارہ آنکھوں کے کام آکر
 کہانیوں میں رہا کریں گے
 اب اس سے پہلے کہ موت آئے

آخری خواب

اب اس سے پہلے کہ موت آئے
 ہمارے جسموں کثیف جسموں کی کھکشاں
 خراب شاموں جوان راتوں کے آسمان کی حدوں سے گر کر
 زمیں کی تہ میں ہوں ریزہ ریزہ
 قریب آؤ گنہ نہیں ہے قریب آؤ
 کثیف جسموں سے حظ اٹھائیں
 اب اس سے پہلے کہ موت آئے
 چلو کہ رو لیں اور اتنا رو لیں
 کہ شامِ غم کا بخار نکلے
 چلو کہ خوشیوں کو ورغلا کر
 سیاہ جنگل ہرے درختوں میں لے کے جائیں
 اور اتنی شدت سے تمقنوں کو وقار بخشیں



یہ واقعہ آج کا نہیں ہے کئی زمانوں کی بات ہے یہ
کہ سینہٴ عشق کے مقابل کڑی کمانوں کی بات ہے یہ

یہ شہرِ اوبام ہے یہاں پر محبتوں کا نصیب ہجرت
یہ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ آسمانوں کی بات ہے یہ

برہنہ سڑکوں پہ تم کو کیسے میں خوشبوؤں کا پتہ بتا دوں
گھنے درختوں میں مجھ سے ملنا چھپے خزانوں کی بات ہے یہ

یہ میں بھی کیا ہوں کہ عاشقی سے ہوس کی تہذیب کر رہا ہوں
میں آدمی ہوں بہت پُرانا نئے جہانوں کی بات ہے یہ

.....

عجیب سے اک سفر پہ نکلیں
کہ جس میں منزل نہ راستوں کا خیال رکھیں
کبھی سمندر کی سبز لہروں پہ پاؤں رکھ کر
کسی جزیذے کی خامشی سے کلام کر لیں سلام کر لیں
کبھی ہواؤں میں اُڑتے اُڑتے
اک اجنبی سے کسی نگر کے برستے بادل کا ہاتھ تھامیں زمیں پہ اُتریں
کسی کو ڈھونڈیں اور اتنا ڈھونڈیں
یہ بھول جائیں کہ کون ہیں ہم
نا تمام

دکھ ہوا ہے دیکھ کر وہ کیا تھا اور کیا ہو گیا
ابتداء میں مان لیتا کاش وہ کہنا مرا

اشک باری بھی نہیں ”بے نام چپ“ کی چارہ جو
بارشوں کے بعد بھی موسم نہیں بدلا مرا

تیرگی شب میں امجد پی ہے میں نے اس قدر
صبح نارنجی سے بھی اترا نہیں نشہ مرا



دور تک تنہا سڑک ہے میں ہوں اور سایا مرا
کتنا اچھا لگ رہا ہے بے نوا ہونا مرا

ایک دشتِ رائیگاں ہے دھوپ کی حد پر کھلا!
کیا بُرا ہوتا جو کوئی مسافر ہوتا مرا

چاہتا اظہار ہوں اظہار کی توقیر بھی
کیا فصیلِ شہر پر رہ جائے گا لکھا مرا

دنیا سے اختلاف کا اچھا نہیں مال
سب لوگ کہہ رہے ہیں جو تم بھی کہا کرو

صحرا کی وسعتیں تری جاگیر ہیں مگر
گاہے کسی غزال کے دل میں بھی جا کرو

بے وقت موت سے تری ڈرتے ہیں ہم بہت
آج یہ غم کڑا ہے مگر خوش رہا کرو



نیلِ فلک کو آہ سے اپنی سیہ کرو
ہو بتلا تو میر کی سنت ادا کرو

شاید کسی کی آنکھ سے آنسو نکل پڑیں
دنیا بے طریق کا نوحہ لکھا کرو

خودِ حُسن بے مثال فریبِ خیال ہے
ہر حُسن بے مثال کو دھوکہ دیا کرو

ایک شعر

ہر چند تیرا قرب مری دسترس میں تھا
میں نے ترے وجود کو آدھا نہیں کیا



یہ جو تیری آنکھوں کی نیلاہٹ ہے
گہرے دُکھ کی چُپ میں سکھ کی آہٹ ہے

کوئی موہن منظر آنکھ میں کُھل جائے
جانے کتنی صدیوں کی اُکتاہٹ ہے

پت جھڑ موسم، میں اور میرا سناٹا
تھا سڑک اور دور تک پیلاہٹ ہے

روشنیوں کو نظم کروں گا کیسے میں
وسعتِ دل میں سہمی ہوئی دُھندلاہٹ ہے



ندی کنار میں اور تو۔
لہ لہ کوئی جادو

میں ترا سایہ ہو جاؤں
تو میرے سائے کو چھو

دکھی دکھی ہے حسن ترا
جیسے کیٹس کی نظم ہو تو

ہرے بنوں کو مت جھلٹا
شہر میں رہ اے شہر کی لو

امجد ساعتِ قرب میں بھی
دل میں ہے اک عالم ہو

.....

جبر

دور کسی جنگل میں بادل مجھ کو ڈھونڈتے ہوں گے
دور کسی صحرا کی وسعت مجھ کو سوچتی ہو گی
دور کہیں باغوں میں کوئل مجھ کو گونجتی ہو گی
دور کسی ساگر کی موجیں مجھ کو کھوجتی ہوں گی
دور کسی کی اچھی آنکھیں مجھ کو روتی ہوں گی
— اور میں دفتر میں بیٹھا ہوں نانِ جویں کی خاطر

ہرے بنوں میں دور کہیں
کوئی نجات کا رستہ ہے

اچھا ہے کوئی اور نہیں
میں ہوں مرا سناٹا ہے

تاریکی کے شاعر نے
روشنیوں کو سوچا ہے

شہر کبیر کے لوگوں میں
کوئی فقیر بھی ہوتا ہے

جا امجد اب لوٹ بھی جا
گھر ترا رستہ نکلتا ہے



ہر منظر اک نوحہ ہے
ہالہ حسن میں روتا ہے

دیوانہ کوئی ایک ہوا
چاند تو سب نے دیکھا ہے

شام ڈھلے اک تنہا شخص
سڑک سے باتیں کرتا ہے

ناموسِ عشق کے لئے شہرِ ریا کے بیچ
اک مُبتلا سے شخص کو گلیوں میں خوار دیکھ

تجھ کو سفر سے باز نہ رکھوں تو کیا کروں
دشتِ طلب کی حد پہ یہ گرد و غبار دیکھ

آخر تجھے بھی لگ گئی لاحاصلی کی چُپ
کس نے کہا تھا تجھ کو سمندر کے پار دیکھ

○

اک دشتِ بے کنار میں اس کو پکار دیکھ
اس شامِ انتظار کو دل میں اتار دیکھ

اے موت تیری خیر کہ تو لازوال ہے
با اختیار لوگوں کو بے اختیار دیکھ

اُکتا چکی ہے شر کی یک منظری سے آنکھ
اے دل کوئی پسند کا اپنے دیار دیکھ

کہ وہ باتیں مری باتیں نہیں ہوتیں
کہ وہ باتیں مری تھالی کی قاتل نہیں ہوتیں
نکرب رات ہماری رات میں
شاخ ہنر پہ چول کھل جائیں
تو یوں لگتا ہے کوئی ہم درینہ میری
ساری باتیں ڈھونڈ لایا ہے کہیں سے ۔
نکراے کاش ان وحشت زدہ لمحوں میں
خود کو میں یہ سمجھاؤں
کہ یہ تھالی ہی تو ہم درینہ ہے میری
مری شاخ ہنر پہ چول جتنے بھی ہیں
اس کے ہیں

سارے ہنر تھالی کے ہیں

میں اس سے بھوت کتا ہوں
مجھے تجھ سے محبت ہے
میں تھالی سے گھرا ہوا
اک نوزی ہوں
اور

باتیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کلیں ہولکوں میں 'شاہراؤں' پر
نکراؤں ہوتا ہوں



شامِ غم ! تو بتا تیری کہانی کیا ہے
رو رہی ہے تو جنہیں اُن کی نشانی کیا ہے

ہاہیں کھولیں کہ ہرام کریں ساحل پر
کچھ نہیں کھٹا ہواؤں کی زبانی کیا ہے

تو کہ یک طرفہ محبت کا حوالہ ہے مرا
داستانِ شبِ غم تم کو سُنانی کیا ہے

لحڑ و صل کا کیا ربط ہے سرشاری سے،
ہجر کا کرب ہے کیا؟ آنکھ کا پانی کیا ہے؟

کس پانی میں جو دیکھا تو بہت رنج ہوا
یہ کھٹا آج کہ دریا کی روانی کیا ہے

پسپائی

اب ایسے شر میں وہ کیا رہے گا
وہ اک سالیہ ہے بن میں جا رہے گا

بڑے ظالم ہیں اس بستی کے باسی
یہاں اب عمر بھر نوحہ رہے گا

بارش کی ساتویں شام

ساتویں شام ہے بارش کی
گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی
شاید کل سورج نکلے گا



دور شر سے جنگل میں ہیں خوش قسمت سے لوگ
چھوٹی چھوٹی خوشیاں جن کی چھوٹے چھوٹے روگ

ہرے درختوں کی سُندرتا بھید یہ کھولے جائے
سُندر تھے وہ لوگ جنہوں نے بن میں لیا تھا جوگ

ہر موسم کا اپنا اپنا مول ہوا کرتا ہے
سرا کی بریلی ہوا میں آؤ منائیں سوگ

بجھے بجھے چہرے ہیں لیکن روشن روشن باتیں
کتنی رونق والے ہیں یہ دکھی دکھی سے لوگ

جتنا تجھ کو سلجھاؤں میں اور ابھتے جاؤ
تم نے امجد پال رکھے ہیں کیسے کیسے روگ



صبح کا ننناک سورج جر کا غماز ہے
رات کی تاریکیوں میں کوئی گہرا راز ہے

ہو نہ ہو اے دل کسی کو ہجر لاحق ہے کہیں
شامِ سرا کی ہوا سے درد کا دروازہ ہے

گو بظاہر مہیاں نا مہیاں کوئی نہیں
آنکھ سے اوجھل مگر اک شخص تیر انداز ہے



اے تنہائی! تیرا کوئی ہمراز نہیں ہے
عرضِ ہنر بھی وحشت ہے اعجاز نہیں ہے

شہر سے ہجرت کی تو دکھ کچھ اور بڑھے ہیں
جنگل میں بھی کونسل کی آواز نہیں ہے

وہ میرا دکھ کیسے سمجھے کیسے بانٹے۔
میرا باہر اندر کا غماز نہیں ہے

ورنہ ترے انجام کو بھی ہم سوچتے رہتے
اچھا ہوا دُنیا تیرا آغاز نہیں ہے

کسی بھیاںک خواب کے ذر سے آنکھ میں امجد
اک مدت سے فیندوں کا دروازہ نہیں ہے

.....



کفر کو ایمان کر سکتا ہوں میں —
جنگ کا اعلان کر سکتا ہوں میں

صبح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
رات پر احسان کر سکتا ہوں میں

اور اب یوں ہے کسی لمحے میں بھی
شر کو دیران کر سکتا ہوں میں

غصہ دل ہے مگر اک ٹھوک کا
ذات کو نشان کر سکتا ہوں میں

شاعری کے باب میں اپنا ہے اتنا تجربہ
شعر کہنا عجز میرا شاعری اعجاز ہے

سوچتی کیا ہو گی وہ مصروفیت کا ہو بُرا
دور جنگل میں مری ایک گمشدہ آواز ہے

ہجر ہے بےزار یہ آسیب کا سایہ نہیں
بے سبب کی ہے قزاقی عشق کی غماز ہے



ہوا یہ کیا کہ فقیرانہ چال چلنے لگے
ذرا سی پی لی تو سب لوگ اچھے لگنے لگے

برا نہیں جو بُری عادتیں بنا ڈالیں
کہ اچھے دوست تو سب رفتہ رفتہ مرنے لگے

کل اس کی آنکھیں بھی خوابوں سے خالی خالی تھیں
سوہم بھی خوابوں کی دنیا سے اب نکلنے لگے

.....

شہر لیلیٰ کا اشارہ چاہیے
دشت میں گزران کر سکتا ہوں میں

اک لبِ لطیف کی جہنش کے عوض
نقدِ جاں قربان کر سکتا ہوں میں

عشق کو خود داریوں سے کیا غرض
منتِ دربان کر سکتا ہوں میں

عشق بھی امجدِ کرشمہ ساز ہے
حسن کو حیران کر سکتا ہوں میں

.....

اے کاش کہ کوئی اور بھی جانے

پپ پپ 'پپ پپ

بارش برسی

بارش موسم سرما کی

شام ہے

لیکن

پچھلے پہر کی تاریکی ہے

تاریکی میں "سنٹیٹ لائٹس" سے

جھلجھل

زندگی

کیا عجب ہو

کہ کسی رات کے سناٹے میں

لوگ چنچیں کہ قیامت آئی

دھنچکا "لوٹ پڑیں

عرش سے ماہ و انجم

اور

ریزہ ریزہ ہوں پھاڑوں کے بدن

کڑے ارض کے ہر گوشے میں

زندگی توڑ دے دم

اور ہوا ہو جائے

جس نے صدیوں سے مرے ذہن کو الجھائے رکھا

ایک بل میں

وہ متعہ... حل ہو جائے

ڈیپریشن

اک پُر خوف سے دیرانے میں
پاگل گئے اور چمگا دڑ
مجھ کو نوپتے رہتے ہیں
کون بچائے..... کون بچائے
کوئی نہیں..... کوئی بھی نہیں
.....

وہ تنہا چپ چاپ سڑک
جو میت ہے میری بہ سوں سے
کیوں
شعر کے.... کیوں نظمیں لکھیں^۳
کیا دکھ ہے یہ سب جانتی ہے
یہ جانتی ہے اس چپ کا مطلب
جو آنکھوں کی دیرانی میں بولتی ہے
یہ جانتی ہے اس ہنسی کا مطلب
جو ہونٹوں کی نیلاہٹ میں روتی ہے
لیکن اس کے جاننے سے کیا ہوتا ہے



آپ در کی بے کرانی چاہیے
مر رہے ہیں لوگ پانی چاہیے

میں بھی اس سے تنگ آیا ہوں بہت
تم کو میری زندگانی چاہیے

یہ ہوؤں تو نیند میری لے اڑی
عشق کی کوئی کہانی چاہیے

پروین شاکر کی المناک موت پر

بڑی ضدی ہے ضد کب چھوڑتی ہے
وہ ”خوشبو“ کی زباں میں بولتی ہے

یہ کیسا سانحہ ”صدیگرہ“ دل پر
بڑی منحوس پت جھڑ کی جھڑی ہے

مگر یہ موت کیوں برحق ہے امجد
یہ کیا پروین شاکر مر گئی ہے

.....



کیا شب تھی کہ مہکے تھے اطراف کناروں کے
اور قافلے ٹھہرے تھے دریا میں ستاروں کے

بادل کے برسنے پر اک لڑکی کو خوش دیکھا!
پت جھڑ میں بھی در آئے آثار بہاروں کے

یہ میں جو نہیں سلگا تپتے ہوئے صحرا میں
اک شخص کی یادوں میں سائے تھے چناروں کے

اے شہر بڑے شہر! رہنے بھی سکوں سے دو
منظر ہیں بہت پیارے چھوٹے سے دیاروں کے

آج میں مہک جاؤں پر کیسے مہک جاؤں
اے کاش کہ کھل جائیں چہرے مرے یاروں کے

سہل اور دشوار راہوں سے پرے
ایک رستہ کھکشانی چاہیے

بن میں کوئی ڈر نہ تھا آسیب کا
شہر میں نقل مکانی چاہیے

سب بلاؤں سے رہائی کے لئے
اک بلائے آسمانی چاہیے

دشمنوں کی کیا ضرورت ہے ہمیں
دوستوں کی مہربانی چاہیے

بدست ہواؤں کو زیبا ہے یہ مگستانی
ہر چند وہ ناخوش ہے آنچل کے سرکے پر

سوچا تھا محبت میں اک طرفہ قیامت کا
حیراں ہیں بہت دونوں چپ چاپ سلگنے پر

فٹ پاتھ کے شاعر تو یہ جرم نہیں کرتے
کیوں نظم کسی تم نے چڑیوں کے چمکنے پر

.....



جادو سا کوئی جاگا بادل کے برسنے پر
اک منظرِ نو چکا موسم کے بدلنے پر

انجام بُرا ہو گا، اک شخص نے روکا تھا
البتہ تھا کوئی مجھ سے دُنیا سے اُچھٹے پر

ناکام محبت کو ہے ننگ سحر کرنا
نادم ہوں بہت میں بھی اک رات کے کٹنے پر

رہنماؤں سے کہو راہ نہ دکھلائیں ہمیں
منزلِ صبح کی ہم راہ گزر جانتے ہیں

اے وطن ایک سے بیٹے تو نہیں ہوتے سب
وہ سرائے میں سہی ہم تجھے گھر جانتے ہیں

وہ تھی دست ہی ہیں افسرِ شاہانہ کہ جو
سنگ ریزوں کو ترے لعل دگر جانتے ہیں

کون طناز ہے یہ بے ہنری پر اپنی
سر کو ساز کہ ہم رقصِ شرر جانتے ہیں

پیارے پاکستان کے حوالے سے

مسکِ عشق کہاں صاحبِ زر جانتے ہیں
عظمتِ خاکِ وطن خاکِ بر جانتے ہیں

اب تو لازم ہوا ہم پر کہ مقابل آئیں
تجھ کو اربابِ ہوس لقمہ تر جانتے ہیں

کیوں ذرات ہو ہمیں صاحبو! تنہائی سے
زندگی کرنے کے ہم سارے ہنر جانتے ہیں

وقت یہ بہار ہو بے کار کی باتوں میں کیوں
خود کا ہی جا بجا کرتا رہوں تیرا رہوں

منتشر ہونے کا ڈر ہے جان تیرے شہر میں
دور جنگل میں کہیں کیجا رہوں تیرا رہوں

تو کہ خوشبو ہے تری تشیر ہونی چاہیے
میں ہوائے شام کا جھونکا رہوں تیرا رہوں

تو کہے تو سنگتاؤں کوئی اچھی سی غزل
شاعروں کے واسطے عنقا رہوں تیرا رہوں

شہر بے توقیر میں تنہا رہوں تیرا رہوں
تو نہ پہچانے مجھے سایہ رہوں تیرا رہوں

کذب کے دربار میں مجھ کو شرف حاصل نہ ہو
تیرہ گلیوں میں کہیں سچا رہوں تیرا رہوں

مے پرستی کو حریفِ دردِ دل کیونکر کروں
بارشوں میں ہجر کو سہتا رہوں تیرا رہوں

محرومی

پھول خوابوں کے جھومتے ہیں
کر رہی ہیں ہوائیں بوس و کنار
اور میں اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں

مبہم خواب

مستور فہم و اوراک سے بھی
ایک ابہم رستا ہے مجھ میں



میں تم سے دُور ہونا چاہتا ہوں
میں اپنے ساتھ رہنا چاہتا ہوں

رہوں میں تاکے شب کا مجاور !
میں گہری نیند سونا چاہتا ہوں

ہوس بھی اک بُری سی ضد ہے میری
میں بچہ ہوں، کھلونا چاہتا ہوں



شعر کہے اور کچھ نہ کیا
شکر ہے اک شاعر تو جیا

کس کو اتنی فرصت تھی
میں نے تجھ کو حفظ کیا

لوگ تھے اللہ والے سب
میں نے تمرا نام لیا

ایک ہوا کے جھونکے نے
خوشبو کا در کھول دیا

غزلیں کہہ کر سوچتا ہوں
تو نے مجھ کو کیا نہ دیا





تیز ہوا تھی نشہ مے بھی زوروں پر تھا
بحر وہ کیسا سرمئی شام کی سڑکوں پر تھا

قربت میں بھی اس نے مجھ کو تنہا رکھا
مجھ پر جو احسان تھا وہ کب اوروں پر تھا

میں اس کے ہونٹوں کی لالی سوچ رہا تھا
اور وہ حیراں قوسِ قزح کے رنگوں پر تھا

بڑی بے کیف شامیں کٹ رہی ہیں
شرابی شام کرنا چاہتا ہوں

مجھے ڈر ہے کہ ظالم ہو نہ جاؤں
کسی سے میں بھی ڈرنا چاہتا ہوں

اب اگلا موڑ شاید ہجر کا ہو
وہ رکنا اور میں چلنا چاہتا ہوں

یونہی کانڈ کئے جاتا ہوں کالے
نہیں لکھا جو لکھنا چاہتا ہوں

کوئی مجھ کو بھی امجد رو رہا ہے
کسی کو میں بھی رونا چاہتا ہوں

”فریاد کی کوئی لے نہیں ہے“

پشتو کے عظیم فلسفی شاعر غنی خان یونے
کی وفات پر

آشفتمانِ شہر کا دلدار مر گیا
بلبلہ مہوؤں کا طلب گار مر گیا

کب ہنر جو کرتا تھا تیرے وجود سے
اے حسنِ بے مثل! وہ فنکار مر گیا

ابرِ بہار ٹوٹ کے برسا ہے رات بھر
یوں ہے کہ کوئی صاحبِ اسرار مر گیا

قاتلِ شہر میں نھرا لیکن فکھ تو یہ ہے
ہرے بنوں کا خون بھی میرے ہاتھوں پر تو

انجمن میں بے سلیہ رہا ہوں دھوپ کی حد پر
شکر ہے میرا سلیہ میرے بچوں پر تو

اعتراف

اے زندگی! اے خوبصورت زندگی
کتنا بھانک کر دیا ہم نے تجھے

اب کون نہ دلوں کی کرے گا مصوری
خوبیاں کی صحبتوں کا گرفتار مر گیا

ہاں سے پیو ضرور مگر خامشی کے ساتھ
رندانِ شہر دیکھنا وہ یار مر گیا

حیرت ہے آج ناصح بے درد موم ہے
ہر اک سے کہہ رہا ہے کہ اوتار مر گیا

”ویراں ہے میکدہ غم و ساغرِ اداس ہیں“
وجدان و آگہی کا وہ نے خوار مر گیا



مٹی کا آدمی تھا کہ وہ نور بخش تھا
صورت تو عام سی تھی مگر نور بخش تھا

گلا تھا ہم کو ثابت و سیار دور سے
نزدیک جا کے دیکھا تو وہ چور بخش تھا

ایک مہر

ہرے درختوں کے سائے ہیں
اک لڑکی چپ چاپ کھڑی تھی
اور پھر ٹوٹ کے بادل برسا

—



میں بھول جاؤں اسے یہ گال اور ہے کچھ
دل تباہ کا لگان خیال اور ہے کچھ

تو وصل رات کو کھتی ہے وہ بند ہوا
پہ میں وہ سوچتا ہوں وہ وصل اور ہے کچھ

اس نے ہم کو بھی دکھاتے دے ہیں مگر
طلب ہے جس کی ہمیں وہ ملال اور ہے کچھ

بست مہین سنی آہوانی شہر مگر
وہ دل کے دشت میں ہے وہ غزال اور ہے کچھ

خوش ہوں کہ اس دیار میں کوئی مری ملے
دنائے بے طریق سے مہرور مخلص تھا

موسم تو بھر کا تھا مگر بھر کا نہ تھا
نزدیک تر بھی تھا وہی جو دور مخلص تھا

کیا استعارے عرض سخن کو وہ دے گیا
دشتِ برہنگی میں جو مستور مخلص تھا

پتھری زمانہ کا آئندہ گد نہیں
کسم میں رہا ہوں کہ مہرور مخلص تھا



نقش ہونا چاہتے ہیں بے نشان ہو جائیں گے
شعر جتنے بھی کہے ہیں رائیگاں ہو جائیں گے

شاعروں کو صاحبو! حکیم زباں بندی نہ دو
مل گئی سب کو زباں تو بے زباں ہو جائیں گے

دایک دشت رائیگاں میں دوڑتے جاتے ہیں ہم،
ہے یقین خود پر مگر وہم و گماں ہو جائیں گے



یہ چُپ ہے کیسی دُکھوں کا تو در کھلا بھی نہیں
محبّتوں کا وہ یک طرفہ سلسلہ بھی نہیں

فلکستِ عہد وفا جان اور کیا ہو گا
کہ میں بھی سوچتا ہوں تیرا فیصلہ بھی نہیں

یہ اور بات کہ مجھ تک پہنچ نہ پائے تو
میں منتظر ہوں ترا اور فاصلہ بھی نہیں

ہمارے حق میں کیسے خود کشی ثواب نہ ہو
سک رہے ہیں کہ مرنے کا حوصلہ بھی نہیں

اکیلا ہوں تو کسی سے گلہ نہیں بہزاد
بجز میں اپنے کسی سے کبھی ملا بھی نہیں

.....

فارغ بخاری مرحوم کے لئے

جسم ہے خاک مگر زخم ہنر زندہ ہے
کیا ہوا تھک گیا تو تیرا سفر زندہ ہے

جبتو آج بھی ہے ایک نئی دُنیا کی
سب کی آنکھوں میں ترا خواب نگر زندہ ہے

آج بھی قافلۂ اہل محبت ہے رواں
فاصلے گھٹتے نہیں راہ گزر زندہ ہے

جڑ ترے کون کرے نعرۂ مستانہ بلند!
شہر زندہ ہے مگر خاک بسر زندہ ہے

ساری دُنیا سے کئے اک آدمی کو دُکھ ہے یہ
خرم و شاداب چہرے سب دھواں ہو جائیں گے

جیت میں ہزارو ہے خود میں سمٹ جانے کا ڈر
ہار جائیں گے اُسے تو بیکراں ہو جائیں گے



خود سے اب اختلافِ سفر کرنا چاہیے
جس رہ چلے جلوس جہاں چلنا چاہیے

کچھ تو طلسمِ شام و سحر سے سوا بھی ہو
جینا ہر انہیں ہے مگر مرنا چاہیے

شاید کتابِ حسن ہی بابِ نجات ہو
اس کو بٹھا کے پاس ات پڑھنا چاہیے

آؤ سکوتِ عشق کی دیوار توڑ دیں!
ہر امن رہ چکے ہیں بت لڑنا چاہیے

بہزاد یوں نہ رات کو تا دیر گھومیے
ہے بزدلوں کا شر یہاں ڈرنا چاہیے

دھوپِ سفاک سہی، درپے آزار سہی!
سایہ دینے کو مگر ایک شجرِ زندہ ہے

کاش لہرائے پھر اک جامِ ہوا میں فارغ
لوگ کہتے ہیں وہ بادیدہ تر زندہ ہے

تہا تھا میں بھی تیری ضرورت مجھے بھی تھی
یہ اب کھلا کہ تجھ سے محبت مجھے بھی تھی

اب کیا گلہ کہ کوئی مجھے جانتا نہیں
لوگوں سے دور رہنے کی عادت مجھے بھی تھی

اچھا ہوا کہ وقت نے دیران کر دیا
کچھ زندگی بتانے کی غلت مجھے بھی تھی

شادی کہیں بھی ہو سو ہو وہ خوش مگر رہے
مجبور عاشقوں کی یہ حسرت مجھے بھی تھی

یہ چپ کا عمد مرے شر میں مدام رہا
مگر وہ شخص کہ جو مجھ سے ہمکلام رہا

وہ مہرباں تھا تو کیوں میکدوں کا رخ کرتے
سکتی شاموں میں میرے لئے وہ جام رہا

کے ہیں شعر جو فرقت میں کیسے اچھے ہوں
کہ مجھ میں ہجر کا موسم برائے نام رہا

مرے لئے تو وہ جیسے کھلا سمندر تھا
یہ میں ہی سوچ کے کچھ خود ہی تشنہ کام رہا

ابر بہارِ شام میں

ابھی کچھ دیر پہلے۔۔۔
صبح و شام زندگی سے
کس قدر بیزار تھا میں
کتنی نفرت تھی مجھے
عین ممکن تھا۔۔۔ کسی بھی لمحہ منوس میں
پہمت کے چٹھے سے لگ کر
خود کشی کر بیٹھتا میں
دفعۃً "یہ کیا ہوا۔۔۔ ابر بہارِ شام میں
اک ہوائے تیز نے۔۔۔ بوندیں وہ برساتیں کہ بس۔۔۔!
صبح و شام زندگی پر
اعتبار آ ہی گیا

میں بھی پلٹ کے آگیا تشنہ لبوں کے ساتھ
دریا کو دیکھنے کی رعایت مجھے بھی تھی

"مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاء کو"
عالم سے کوئی دور کی نسبت مجھے بھی تھی

—



ماہِ تمام چمکا وہ بامِ یاد آیا
یادش بخیر ہم کو اک نامِ یاد آیا

دیکھا کسی کو ہم نے زلفِ دراز کھولے
برسوں کے بعد دل کو آرامِ یاد آیا

اک ہم ہی تیرے در کے ٹھہرے فقیر ورنہ
تیرے تو عاشقوں کو انجامِ یاد آیا

اک پھول کھل اٹھا کیا شاخِ ہنر پہ میری
گم گشتہ ساعتوں کا انعامِ یاد آیا

قطعہ

گاہے حدودِ دشت سے نکلا بھی کیجئے
کچھ تو خیالِ خاطرِ دنیا بھی کیجئے

ہر چند ذوقِ دشتِ نووردی بھی خوب ہے
لیکن کسی کو شہر میں لیلیٰ بھی کیجئے



وہ بھی خیال و خواب میں کچھ معتبر رہا نہیں
طے ہو چکے ہیں فاصلے کوئی سفر رہا نہیں

بے خود و مبتلا تو ہیں لیکن سپردگی نہیں
ہیں صد ہزار در مگر وہ جنگ در رہا نہیں

اک عشق بے پناہ سے ہم لازوال ہو گئے
ہونے کا اور نہ ہونے کا کوئی بھی ڈر رہا نہیں

کوئی کہے کہ عشق ہے یا محض دل لگی ہے یہ
دل میں کوئی رہا تو ہے کوئی مگر رہا نہیں

یہ بات ہے تو کیوں نا واں جا قیام کر لیں
ذکر بہشت سُن کر " کلام " یاد آیا

تم نے کہا تھا اسجد یہ محض دل لگی ہے
وہ صبح کا ملا تو ہر شام یاد آیا

.....



خداؤں کی حفاظت کر رہا ہوں
گنہ یہ حسبِ عادت کر رہا ہوں

مدینہ ہے نہ کوئی شہرِ کوفہ
بڑی بے سود ہجرت کر رہا ہوں

خدا مجھ کو یقیناً بخش دے گا
میں بچہ ہوں شرارت کر رہا ہوں

حکمت کہو تو ہے بجا لیکن ہنر نہ جانئے
فن جو کسی جمال کے زیرِ اثر رہا نہیں

بس ہو چکی ہے انتہا، آوارگی سے باز آ
بہزاد ایک عمر سے تو اپنے گھر رہا نہیں



دکھ تجھے ہو مگر شر کو جل جانا ہے
تیرے شاعر نے بہت دُور نکل جانا ہے

کون دیکھے گا یہاں کس کو ہے فرصت اتنی
چاند نکلا ہے مگر چاند نے ڈھل جانا ہے

میں وہ خود دار! خدا سے بھی نہ مانگوں تجھ کو
یہ الگ بات کہ اس دل نے مچل جانا ہے

.....

ہے معنی خیز میری بے وفائی
حسینوں سے رعایت کر رہا ہوں

بہت مشکوک ہے کردار یزداں
سو خود تعمیر جنت کر رہا ہوں

زمانے سے بچانا ہے کسی کو
محبت میں سیاست کر رہا ہوں

.....

آج بھی ہے دیوارِ دل کی ہر تصویر سے نفرت سی
کتنا ہمیں مایوس کیا ہے اس گھر کی آرائش نے

ورنہ کہاں ہم اور کہاں یہ عرضِ ہنر کی زیبائش
غزلوں کو دیوان کیا ہے ایک تری فرمائش نے

حال کی حد سے دور نکل کر ماضی ماضی ہو جاؤں!
کتنی پرانی باتیں چھیڑیں سرا کی اک بارش نے

.....



رات مجھے رستے میں روکا تیز ہوا اور بارش نے
کتنا شور مچایا دل میں ایک دبی سی خواہش نے

منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن نظم تو کرنا واجب ہے
کچھ تم نے برباد کیا ہے ، کچھ یاروں کی سازش نے

جی تو بہت للچایا لیکن دشت و جبل کی سیر نہ کی
جیسے قید کیا ہے ہم کو گھر کی ہر آرائش نے

کتے دریاؤں، صحراؤں اور جنگلوں کا فسون فطرت تھا مرا
میں نہیں جانتا
میں نہیں جانتا
میں تو وہ ہوں کہ جو
اپنے ہی سائے میں سو گیا تھا
کل وہ تقریب میں جب تری یہ ستارہ سی آنکھیں انھیں مری جانب
تمیں علم ہے کیا ہوا؟
میں نے سائے کو دفنا دیا۔۔۔
میں نے سائے کو دفنا دیا۔۔۔

کسی کو دیکھ کر

تم اتنے برس کس نگر میں رہی
میں تمہیں دھونڈتے دھونڈتے تھک گیا تھا
اپنے ہی سائے میں سو گیا تھا
کتنے سرشار موسم یہاں آئے تھے
اور پلٹ بھی گئے
کتنے چہرے کھلے۔۔۔ کھل کے مرجھا گئے
کتنے ظالم یہاں۔۔۔ کتنے مظلوم تھے



گلہ میں کیسے کروں تجھ سے نارسائی کا
یہی جواز ہے میری غزل سرائی کا

انا پرست تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
کہ قربتوں میں بھی موسم رہے جدائی کا

اسی لئے تو عدو سے نہ خوں بہا مانگا
کہ میرے قتل میں تھا ہاتھ میرے بھائی کا



کسی جمل میں کھونا تھا، خود کو بھولنا تھا
کسی گھر میں ہمیں بھی کسی کو ڈھونڈنا تھا

بہت سی باتیں کھلاتی ہیں دشتِ جان میں پھول
مگر وہ بات کہ جس پر کسی سے روٹھنا تھا

مگر نکل نہ سکے اپنے دائرے سے ہم
خدا کو ماننا تھا اور جوتوں کو پوچھنا تھا

یہ اور بات کہ پتھر کا ہو گیا ہوں میں!
کسی پری کا پتہ خوشبوؤں سے پوچھنا تھا

میں تو خیر شکستہ تھا
تو بھی کہاں اب سالم ہے

وصل کا لمحہ خواب حسین
ہجر کا موسم دائم ہے



سارا شر ہی ظالم ہے!
اب تو ہجرت لازم ہے

سارے رشتے ٹوٹ گئے
درد کا رشتہ قائم ہے

سوچتا ہے اک فریادی
کون ہمارا حاکم ہے؟

ہو کہ نہ ہو یہ شر مگر
دوہینگوں پر قائم ہے

دو شعر

روٹھے ہیں ایک بار تو پھر گھر نہیں گئے
ہر چند جی نے چاہا بہت پر نہیں گئے

افعی کی طرح ڈستی ہے اب تو انائے عشق
ہم بھی کسی کو ہار کے کیوں مر نہیں گئے



کھڑا ہوں کب سے میں باہر پہ سوچتا ہی نہیں
عجیب شخص ہے دروازہ کھولتا ہی نہیں

میں سوچتا ہو کہ تجھ بن جیوں گا میں کیسے
تجھے یہ وہم کہ تجھ کو میں چاہتا ہی نہیں

نکلت کھائی ہے ہر اک محاذ پر میں نے
یہ اور بات کہ میں ہار مانتا ہی نہیں

یوں کھیلنے کو تو میرا بھی دل مچلتا ہے
پیر میرے ساتھ یہاں کوئی کھیلتا ہی نہیں

بکھر گئے تھے جو اعضاء سیٹ لایا ہوں
بس ایک چہرہ ہے جس کو میں ڈھونڈتا ہی نہیں



سب سزاؤں کی جزا پائیں گے
نہیں آجائے گی سو جائیں گے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں شہروں میں نجات
لوگ جنگل سے بھی ہو آئیں گے

بے سبب سزاؤں پہ پھرتے ہوئے لوگ
اپنے ہونے کی خبر لائیں گے

ہم کو جانا ہے کسی اور طرف
دوست مجبور ہیں گھر جائیں گے

وہ شام

وہ شام ٹھہر گئی آنکھوں میں
جس شام تمہاری آنکھوں نے

سر راہ کہی وہ بات کہ جو
خوشبو کے درتے کھولتی ہے

وہ شام ٹھہر گئی آنکھوں میں

جس شام کی چپ میں بس یونہی
کچھ تم نے بھی کہنا چاہا تھا
کچھ میں نے بھی کہنا چاہا تھا

وہ شام ٹھہر گئی آنکھوں میں

جس شام کی سرد ہواؤں میں
یرے کوئل جسم کی خوشبو نے
تادیر مجھے مکائے رکھا



یہ دیکھی دیکھی سے جو لوگ ہیں ترے شہرِ غم کے فقیر ہیں
انہیں چشمِ کم سے نہ دیکھنا یہ بشارتوں کے سفیر ہیں

وہاں ایک طائرِ خوشنوا ہے مہیوں کا پیامبر!
یہاں شغلِ جنگ میں جلا بھی قاتلوں کے امیر ہیں

میں تو تیرگی ہی سا کروں، میں تو روشنی ہی نکلا کروں
مری تیرہ شب کی جبین پر مرے دوستِ مایوس ہیں

بادباں کھولے ہیں ملاحتوں نے
گیت اچھا سا کوئی گائیں گے

وہ پرندے جو اڑے جاتے ہیں
پھول ہیں خوشبوئیں برسائیں گے

چاندنی ڈھونڈنے امجد صاحب
دور جھیلوں کے نگر جائیں گے



شیشہ دل کے مقابل سنگ ہے اپنی جگہ
اہل دنیا سے ہماری جنگ ہے اپنی جگہ

چینی چٹکھارتی سرکیں نصیبِ شر کا
اک سکوتِ شام کا آہنگ ہے اپنی جگہ

ناصح بے دردِ مدت سے ہے منطقِ آزما!
اور ہمارا عاشقانہ ڈھنگ ہے اپنی جگہ

زندگی کرنے کی کوئی دار دیتا ہے مگر
ہجر کی شب صبح کرنا ٹنگ ہے اپنی جگہ

وہ یگانہ اپنے کمال میں 'میں' ہوں تھا اپنے زوال میں
میں بھی آپ اپنی مثال ہوں وہ بھی آپ اپنی نظیر ہیں

یہ ہوا ہے کیا کہ تھے نہیں تری اٹک باری کا سلسلہ
کئی دن سے آئہ نوشوا بنے آپ میرِ فقیر ہیں

.....



ہزار لوگوں میں وہ معتبر نہیں آیا
کہ خود نمائی کا اس کو ہنر نہیں آیا

تجھے تلاشِ نئی اور حسیں جگہوں کی ہے
میں اک جزیرہ ہوں کوئی ادھر نہیں آیا

میں تیرے شہرِ طلسمات سے نہیں نکلا
میں گھر میں بیٹھا ہوں لیکن میں گھر نہیں آیا

کسی سے عشق جو کرتے تو کوئی بات بھی تھی
گلد نہیں جو کوئی بام پر نہیں آیا



آخری حیرت باقی ہے
موت کی دہشت باقی ہے

جسم تو مالا مال ہوئے
روح کی غوت باقی ہے

آج بھی میرے ہونٹوں پر
تیری حدت باقی ہے

اور تو سب کچھ ہار چکے
درد کی دولت باقی ہے

جب تک تیری یاد میں ہوں
میری شہرت باقی ہے

—

دو شعر

کبھی دھوپ میں پکارو کبھی بادلوں میں ڈھونڈو
وہ جو آنکھ سے ہے اوجھل اسے موسموں میں ڈھونڈو

کسی دن نصیب جاگے مرے شرِ بے اماں کا
کوئی فاختہ کا پر ہی کہیں جنگلوں میں ڈھونڈو

یہ میری آخری سچائی بھی ثار اس پر
وہ ایک خواب جو نیندوں میں در نہیں آیا

یہ شعر کہنا تو امجد و بال جان ہوا
خوشا وہ لوگ جنہیں یہ ہنر نہیں آیا

شاید نقب زنوں سے تحفظ یہ دے سکے
روٹی کا ایک ٹکڑا سگ در کے واسطے

لہریں ہیں بدحواس تو کرنیں ہیں مضطرب
ٹکڑا ہے چاند جیسے سمندر کے واسطے

لے دے کے ایک جائے اماں ہے یہ ناصحوا!
”میخانہ کیسے چھوڑ دوں دفتر کے واسطے“

○

یہ کیا کہ صبح و شام کریں زر کے واسطے
سوا کچھ اور چاہیے گا سر کے واسطے

جب اختلافِ رزق مرا شہر سے رہا
گھرِ معاش کیسے کوں گھر کے واسطے

ہو عمد کوئی خون سے رہتے ہیں تر ہر
کچھ سر تو جیسے وقف ہیں پتھر کے واسطے

تیری آواز ہی کافی ہے مجھے
گم شدہ عشق منانے کے لئے
جس کو روٹھے ہوئے صدیاں کزری
چیننے شرکی تنائی میں
مدتوں بعد یہ اک "لظم" کسی ہے میں نے
یہی اک لظم مرے عشق کا ہے پہلا سراغ
پھول ہمیں گے مری شاخ ہنر پر پھر سے
گھر سے نکلوں گا میں خوشبو کے سفر پر پھر سے

آواز

میں تجھے دور ستاروں میں عبث ڈھونڈتا تھا
یہ کھلا آج کہ آباد ہے ست رنگ زمیں پر تو کہیں
جان!

یہ سچ ہے کہ میں نے نہیں دیکھا تجھ کو
اور ضروری بھی نہیں ہے کہ ترے عارض و لب
روشنی بن کے مری تیرہ شبی سے ابھیں
میں نے اب تک تو بس "آواز" سنی ہے تیری



شبِ سیاہ میں یہ روشنی سے کیسی ہے
دیارِ غم زہ! تجھ کو خوشی سی کیسی ہے

اتر رہی ہیں یہ آنکھوں پہ لہنڈکیں کیسی
یہ دل میں کھلتی ہوئی شعل سی کیسی ہے

یہ کیسی خوشبوئیں چھنتی ہیں شب کی زلفوں سے
سوارِ روح میں یہ نغمی سی کیسی ہے

مگر وہ عشق بھی آخر فریب ہی نکلا
یہ تیرے ہوتے ہوئے بھی کمی سی کیسی ہے

ہے مہمان کوئی ہم سے بے حسوں پر بھی
کہ شہرِ مردہ میں یہ زندگی سی کیسی ہے



موسم کڑا تھا ہجر کا لیکن سراب سا رہا
میں بھی رہا ہوں خوش بہت وہ بھی گلاب سا رہا

میں بھی ہوں کتنا سنگدل اس کو کبھی پڑھا نہیں
جو شخص میرے واسطے اکثر کتاب سا رہا

چھو کر اسے جو دیکھا تو مجھ سی گئیں محبتیں
اچھا لگا ہے آنکھ کو جب تک وہ خواب سا رہا

اس مہیاں کے شہر میں موسم عجیب تھا مرا
دل میں دہکتی دھوپ تھی سر پر سحاب سا رہا

بہزاد خوش رہا کرو گڑھنے سے فائدہ ہے کیا
اس شہر پر تو عمر بھر کوئی عذاب سا رہا

خواب میں کسی ہوئی نظم
ہاں اور تنہا ہو کر
گنگو مجھ سے کہے
جنگوں میں وہ بچے
شہر سے آتا ہے
وہ قمیص مل جائے گا
دھونڈنے لگا ہے
خوبصورت تھے وہ لوگ
عشق جو کرتے رہے



کون سفاک کے عتاب میں تھے
لوگ سارے کسی عذاب میں تھے

قریبوں کا تھا وہ تمنائی
فاصلے میرے انتخاب میں تھے

کیا خبر کس مگر ہوئے آباد
وہ جو اچھے دنوں کے خواب میں تھے

یہ تو ہم کو ہی پہ پیار آیا
ورنہ ہم لوگ کس حساب میں تھے

کتنے سچے تھے قول کے امجد
وہ جو دشمن مری جناب میں تھے

.....

دو شعر

شہر کے سب ہاسیوں کا ایک سا انجام تھا
صورتیں بگڑی ہوئی تھیں آئینہ دشنام تھا

جانے کس کی آہ کا تھا یہ طلسماتی اثر
تیرگی چھٹی نہ تھی اور صبح کا ہنگام تھا

آؤ تھوڑی دیر کو
جی لیں پرانے عہد میں

جاگتی ہے چاندنی
لوگ ہیں سوئے ہوئے



کوشش کی بات کی، کوئی وعدہ نہیں کیا
عزم وفا کا اب کے اعادہ نہیں کیا

اے کاش عہدِ رفتہ سے آواز دے کوئی
مدت سے ذکرِ ساغر و بادہ نہیں کیا

آخر کو گھر ہی لوٹنا ٹھہرا تو فائدہ
= سوچ کر سفر کا ارادہ نہیں کیا

نانِ جویں ملی تو شکم سیر ہو گئے
فکرِ معاش ہم نے زیادہ نہیں کیا

.....



یہ کیا کہ لطفِ شامِ ملاقات وہ نہیں
کوئی نہیں ہے بات تو کیوں بات وہ نہیں

تو بھی کھچا کھچا ہے زیاں کے سوال پر
میں بھی مجھا مجھا ہوں کہ حالات وہ نہیں

میری تو ساری انگلیاں برفاب ہو گئیں
یہ جو ہیں میرے ہاتھ میں یہ ہاتھ وہ نہیں

آنکھوں کو کیا کروں کہ وہ منظر نہیں رہا
روحیں ہیں حیرتیں کہ طلسمات وہ نہیں

خوش ہوں کہ مہر کی طرح امجد میں خوار ہوں
اچھا ہوا جو عزتِ سادات وہ نہیں

.....

ایک حسرت

کسی جنگل کی تنہا شام میں
سایا نظر آئے
کوئی اپنی طرح سے شرمیں
تنہا نظر آئے
مسافر دیکھ کر کوئی ہمیں
فہمستہ نظر آئے
کوئی صدیوں پرانے عشق کو
روتا نظر آئے
کسی سے عشق ہو جائے

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library